© rasailojaraid.com

وثلاثة اشهر تسعة و	تیس تیس دن کے اور تین ماہ انتیس انتیس
عشرون یومًا بالھلال ولا	دن کے ہو جاتے ہیں مگر یہ تسلسل اس سے
یتوالی اکثر من ذلک .	زیادہ نہیں رہتا۔
واما بالحساب فدائمًا	لیکن حساب کے اعتبار سے ہمیشہ ایک
شھر ثلاثون وشھر تسعة و	ماہ تیس دن کا ہوتا ہے اور دوسرا انتیس کا۔
عشرون لا تتغیر (ص ۹۱۱ طبع مصر ۱۳۷۹ھ)	اور اس میں تبدیلی نہیں ہوتی۔

اس تفصیل سے معلوم ہو گیا کہ تقویم کا حساب اصطلاحی ماہ و سال پر مبنی ہے، اور مسلمانوں کا حساب حقیقی ماہ و سال پر۔ اس لیے ہر دن اور ہر تاریخ میں ان دونوں کا مطابق ہونا ضروری نہیں ہے، اس لیے اختلاف کی صورت میں بجائے اس کے کہ تقویم سے مؤرخین کے بیان کردہ دنوں اور تاریخوں کو جانچا جائے۔ علم و دانش کا تقاضا یہ ہے کہ خود مورخین کے بیان کردہ دنوں اور تاریخوں سے تقویم کو درست کر لیا جائے، کیونکہ مورخین اسلام نے اپنی تصانیف میں ہر دن کی وہی تاریخ لکھی ہے جو رؤیت ہلال کے لحاظ سے اس روز ان کے یہاں تھی، اور یہی تاریخ حقیقی تاریخ ہے، اور اسی کا شرع میں بہ نص قرآنی اعتبار ہے۔

(حاشیہ صفحہ گزشتہ)

کی بنا پر دیا ہے تو پھر کسی کو کیا حق پہنچتا ہے کہ بغیر ہلال کو دیکھے یا اس کی رؤیت کی شہادت گزرے محض اپنے حساب و کتاب کی بنا پر اس حق کو ان سے چھین لے اور اپنے اعلان کے مطابق انھیں صیام و افطار پر مجبور کرے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ترجمہ:- از پروفیسر وفائی ایس طاہر علی

شاہ عبداللطیفؒ بحیثیت ایک ترقی پسند شاعر

(سندھ پر عالمی مذاکرے میں پڑھا گیا۔)

افلاطون نے اپنے جمہوریہ میں شاعروں کو کوئی مقام نہیں دیا۔ ان کا خیال تھا کہ شاعری کا کام صرف عکاسی کرنا ہے اور یہ مرحلہ نہایت صبر آزما اور ہمت شکن ہے، لیکن ارسطو نے واضح کیا کہ شاعری ایک مثبت اور دھماکہ خیز عمل ہے، جس کا سماج میں کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہے۔ ارسطو نے شاعری کو صرف آئینہ نہیں سمجھا بلکہ وہ اسے تبلیغی طاقت تصور کرتے تھے، وہ جانتے تھے کہ ادبیات سے انسان کے ضمیر کی تطہیر ہوتی ہے اور پھر اس سے ماحول والا معاشرہ بھی تبدیل ہونے لگتا ہے۔

بنا بریں ادبیات کا ایک ثقافتی مقصد ہوتا ہے اور سماج میں ادیب ایک ذمہ دار فرد ہے۔ جب یہ بات مسلّم ہو چکی کہ ادبیات کا سماج کے ساتھ چولی دامن کا رشتہ ہے تو پھر ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ آیا ادیب قدامت پسند ہے جو معاشرے میں عداوت اور نفرت کے بیج بوتا ہے یا وہ اس کو صلح و آشتی کی طرف لے جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر، آیا وہ اپنے ماحول کا صرف خاکہ کھینچتا ہے یا وہ اپنی زندگی میں کسی کارواں کا سالار بھی ہے۔

چنانچہ ہمیں دیکھنا چاہیے کہ شاہ عبداللطیفؒ اس معیار پر کیسے اترتے ہیں۔ اس سوال کا جواب دینے سے پیشتر ہمیں قدامت پسندی اور ترقی پسندی کے مفہوم کو واضح کرنا ضروری ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اگر ترقی پسندی کا مفہوم یہ لیا جائے کہ ہم تاریخ کو گروہ بندی کی نظر سے یا جماعتی کشمکش کی عینک سے دیکھیں یا اس کا سیاسی نقطۂ نظر سے یا مذہبی عقیدے سے جائزہ لیں تو پھر شاہ صاحب کسی زمرے میں نہیں آسکتے۔ لیکن اگر اس کا مفہوم یہ ہو کہ ادیب کا اپنے ماحول کے مسائل میں کیا حصہ ہے اور اپنے رسوم و روایات اور نظریات کے ساتھ اس کا کیا ردِّعمل ہے تو معاملہ آگے بڑھ سکتا ہے۔

ہمیں ایک اور چیز کا بھی خیال رکھنا ہوگا، ہر سماج میں ایک ارتقائی مرحلے پر گروہ بندی نظر آتی ہے جو دو حصوں میں بٹ جاتی ہے۔ ایک حصہ محنت کشوں کا ہے اور دوسرا ذہنی کام کرنے والوں کا۔ اس مرحلے پر پہنچ کر ہنر اور ثقافت کے دو چشمے دوش بدوش بہنے لگتے ہیں ایک چشمہ عوامی ادب یعنی لوک فن کا ہوتا ہے، اس میں مزدوروں کی عرق ریزی اور بیدار مغزی کارفرما ہوتی ہے۔ اس کی داستان بھی بڑی طویل ہے جو لوک کہانیوں میں مضمر ہے۔ گورکی نے تو اس بارے میں یہاں تک کہا ہے کہ کوئی شخص تاریخ کا ماہر نہیں بن سکتا جب تک وہ ان لوک کہانیوں اور دنت کتھاؤں کو نہ پڑھے۔ ان سے تو بقول اس کے ادب اور سماج کے زوال و ارتقاء کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ دوسرا چشمہ ہمیں تمدن و ثقافت کے عہد میں ملتا ہے جو عام فہم زبان میں "ادبیاتِ عالیہ" کہلاتا ہے، یہاں ہمیں شیکسپیئر، فردوسی اور غالب کی تخلیقات نظر آتی ہیں۔ ان تخلیقات کا پایہ بہت بلند ہے مگر ان کو بھی عوامی ادب کا مرہونِ منت ہونا پڑتا ہے۔ ٹیگور کہتے ہیں کہ

> "ادب ایک لغو اور مہمل چیز ہے اگر انسان اس کا مرکزی کردار نہ ہو۔ یہی تو ایک راز ہے جو مجھ میں تجلیاتِ الٰہی کی طرح موجود ہے اور یہ لافانی ہے"

ایک ادیب یا شاعر اپنے زمانے کی پیداوار ہے، شاہ صاحب کا عہد برصغیر میں افراتفری والا عہد تھا۔ سندھ میں زور آزمائی کی جنگیں چل رہی تھیں، چنانچہ ہر کامل فن کار صرف اہم باتوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور غیر اہم کو چھوڑ دیتا ہے۔ شاہ صاحب نے بھی یہی کیا۔ انھوں نے مقامی وڈیروں کی ہاؤ ہُو کی طرف دھیان نہیں دیا اور غیر معروف شخصیتوں کو نظر انداز کر دیا، لیکن انھوں نے انگریزوں اور پرتگالیوں کے استحصال کو پہلے سے بھانپ لیا تھا، یہ لوگ ہمارے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ملک کے سیاسی اور اقتصادی زندگی پر اثر انداز ہو رہے تھے اور آنے والے زمانے میں ہم کو اپنی غلامی کی زنجیروں میں جکڑنا چاہتے تھے چنانچہ وہ بول اٹھے کہ

"کہاں ہیں ہمارے کشتی کھینے والے ؟ دیکھو بدلیسیوں نے بھیس بدل کر گھسنا شروع کر دیا ہے۔ ہے کوئی ناخدا ؟ جو اس طوفان کا رخ موڑ دے"

بھلا آج کتنے لوگ ہیں جو استحصال کرنے والوں کو دیکھ سکتے ہوں جیسا کہ شاہ صاحب نے دو سو سال قبل دیکھا تھا!

قرونِ وسطیٰ میں جاگیرداری کے خلاف تصوف ایک باغیانہ تحریک تھی۔ اس زمانے میں تمام تحریکوں پر مذہبی لبادہ ڈال دیا جاتا تھا۔ چنانچہ تصوف بھی ایسا ہی ایک لبادہ تھا۔ بھگتی تحریک اور یورپ (؟) تصوف دونوں دوش بدوش چلنے والی مذہبی تحریکیں تھیں۔ اگر ان پر سے مذہب کا ظاہری لبادہ اتار لیا جائے تو وہ حکومتِ وقت یعنی افسر شاہی اور مذہبی پیشواؤں کے خلاف سازشیں معلوم ہوتی ہیں۔ افسر شاہی نے اور مذہبی پیشواؤں نے ایک جانب خالق و مخلوق میں رکاوٹ کھڑی کر دی تھی تو دوسری جانب حاکم و محکوم کے درمیان روڑے اٹکا دیئے تھے۔ اسی سبب سے حکامِ وقت نے اور حامیانِ مذہب نے صوفیوں کو تختۂ دار پر لٹکا دیا تھا۔

صوفی کی نگاہ میں انسان خلقت کا ایک مرکزی نقطہ ہے، وہ سمجھتا ہے کہ احترامِ آدمیت سے حق شناسی اور معرفتِ الٰہی حاصل ہوتی ہے۔

شاہ لطیف کے عہد تک مادی اور سماجی ترقی اس حد تک نہیں پہنچی تھی کہ وہاں جا کر، مساواتِ انسانی کا خیال واضح طور پر اجاگر ہو جائے۔ اسی وجہ سے صوفی شعراء نے مساواتِ انسانی کی تلقین توحیدِ الٰہی سے کی۔

شاہ کی شاعری میں تصوف کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ انھوں نے درباری زندگی سے پرے رہ کر اپنے لیے ایک نئی راہ ڈھونڈ نکالی تھی جو ان کی عظمت کا بیّن ثبوت ہے۔ اُن کا کردار اور ان کی شخصیت ادب اور سماج دونوں میں نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اصولوں کو کبھی قربان ہونے نہیں دیا اور کانٹوں کے فرش پر اپنی زندگی کی آرائش کی۔ اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طریقے سے انھوں نے مساوات کی دُھن کو محبت کے نغموں کے ساتھ خوب الاپا۔ وہ کہتے ہیں :۔

"اچھائیوں کو اپنی شخصیت میں جذب کر لو۔ تب عاشق و معشوق
یا حبیب و محبوب میں کوئی فرق باقی نہ رہے گا۔ ہم اپنی کوتاہ نظری
سے دیکھ نہ سکے ورنہ وہ تو خالق و مخلوق دونوں ہے"

بقول شاہ صاحب نورِ الٰہی ہر جا جلوہ گر ہے۔ ذات پات، نسل اور عقیدہ کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ 'من و تو' سے تو توحیدِ ایزدی کا بطلان ثابت ہوتا ہے۔

جتنی شکلوں میں محبوب نظر آتا ہے اتنی ہی شکلوں میں عشق بھی جلوہ نمائی کرتا ہے۔ شاہ صاحب کی نظروں میں عشق کی دو شکلیں ہیں، ایک تخلیقی اور دُوسری تملیکی۔ سندھ کی قدیم روایتی داستان "سستی اور پنّوں" تخلیقی ہے۔ سستی زندگی کی تمام آسائشوں کو چھوڑ کر پنّوں کی تلاش میں جنگل جنگل بھٹکتی ہے۔ لیکن خود غرضی اور خود افادیت کے جذبہ نے سستی کی محبّت کو داغدار بنا دیا ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں :۔

جو سمندر میں سفر کرے
اسے پیاس کیونکر لگے
پنّو تو شاہ رگ سے زیادہ قریب ہے
سستی! اُسے جنگل میں کیوں ڈھونڈتی ہے ؟

عشق کی تحقیر نہیں ہو سکتی، وہ تو از خود بالقوۃ ہے۔ اگر اس کی تخلیقی طاقت معطل کر دی جائے تو وہ ایک تخریبی طاقت ہو جاتا ہے۔ ایلیاڈ اور رامائن شہرۂ آفاق رزمیہ کلام ہیں۔ لیکن وہ عشق کی تخریبی طاقت کے نمونے ہیں۔ ان داستانوں نے قوموں کو غرق کر دیا۔ شاہ صاحب اس خطرناک پہلو سے بہت باخبر ہیں۔ چنانچہ "سستی پنّوں" میں وہ عشق کو تخلیقی طاقت بنانے کی تلقین فرماتے ہیں۔

شاہ صاحب کے رسالے میں اور بھی بہت سے رُومانوی افسانے ہیں، جن میں انھوں نے تصوف کو نغموں سے ہم آہنگ کیا ہے۔

داستانِ "عمر ماروی" ایک تملیکی عشق کی مثال ہے۔ عمر ایک با اختیار سردار ہے۔ وہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ملیر کی ایک دیہاتی لڑکی سے عشق کرتا ہے اور اسے ایک قلعے میں بند کر دیتا ہے۔ یہ لڑکی جس کا نام ماروی تھا ہے، ایک مفلس گھرانے میں پیدا ہوئی ہے لیکن طاقت اور دولت سے بالکل بے نیاز ہو کر قید و بند کی صعوبتوں کو جھیلتی ہے۔ وہ کہتی ہے:

مجھے چاروں طرف سے جکڑ دیا ہے
میرا قید خانہ مقفل ہے
جاسوس ہر قدم پر کھڑے ہیں
پیارے ماروی! میں تجھے کیسے بتاؤں؟
میرا جینا اجیرن ہو گیا ہے۔

اُسے اپنے وطن کی یاد ستاتی ہے تو کہتی ہے:

میری نظریں اپنے دیس کی طرف لگی ہوتی ہیں
میری لاش کو میرے عزیز و اقارب کے حوالے کر دینا
دمِ واپسیں سے پہلے
مجھے ملیر لے چلو
عمر! مجھے ماروی کے پہلو میں اپنے دیس کی ٹھنڈی چھاؤں میں دفن کرنا

ماروی سندھ کی سرزمین میں محبت اور غیرت کی نمائندگی کرتی ہے۔ اہلِ سندھ ماروی کے ساتھ ہم نوا ہو کر اسی کے مانند اپنے حقوق طلب کرتے ہیں۔ ماروی حریت اور آزادی کی بھی نمائندہ ہے۔ وہ ظلم و ناانصافی کے خلاف احتجاج کرتی ہے، اس کی آواز نے سارے کائنات میں لرزہ پیدا کر دیا ہے۔ وہ صنفِ نازک کی آزادی کی علمبردار بھی ہے۔ وہ ان تمام باتوں کی نہ صرف سندھ میں نمائندگی کرتی ہے بلکہ عالم کے ہر گوشے میں وہ مظلوم عورت کی حمایت کرتی ہے۔ ماروی اس وقت تک زندہ جاوید رہے گی جب تک کہ آزادی کے لیے انسان کی جدوجہد باقی ہے۔ وہ ایک برگزیدہ ہستی ہے جسے کوئی ناپاک ہاتھ چھو نہیں سکتا۔

لینن نے لکھا ہے کہ ٹالسٹائی وہی زبان بولتا تھا جو لاتعداد روسیوں کی زبان تھی۔ گرچہ یہ روسی لوگ اپنے حکمران طبقے سے نفرت کرتے تھے اور انھیں اس طبقے کی مخالفت میں کوئی کامیابی نصیب نہیں ہوئی تھی کیونکہ انھوں نے تو مسلسل کوشش کی تھی اور ان کے پاس کوئی ایسا [illegible] منصوبہ تھا۔ یہ تو شاہ صاحب

© rasailojaraid.com